Date of Publication: 02-01-2013 **PRICE Rs. 2/-**

POSTED ON 03-04 Jan. 2013
R.N.I No. 2186/57

POSTAL REGN. NO. DL (C) -01/1195/2012-14
Licensed to Post Without Prepayment U(C)160/2012-14

HAMARI ZABAN (WEEKLY)

ہفت روزہ

ہماری زبان

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

08-14 January 2013 ۸ تا ۱۴ر جنوری ۲۰۱۳ء

Issue: 2, Vol.: 2 شمارہ نمبر: ۲، جلد نمبر: ۷۲

۱۹۶۱ء کی بات ہے، راقم السطور نے ضلع کٹک (اڑیسہ) کے معصوم پور نامی گاؤں سے ایک ایسا قلمی نسخہ دریافت کیا جس میں اردو اور فارسی کے دیگر شاعروں کے علاوہ نظیر اکبرآبادی کی چند نظمیں بھی شامل تھیں۔ اس نسخے کے کاتب حفاظت علی معصوم پوری تھے اور اس کی تحریر کا زمانہ ۱۸۵۷ء کے لگ بھگ تھا چوں کہ نظیر اکبرآبادی کا پہلا دیوان بیسویں صدی کے اوائل ہی میں شائع ہوا، اس لیے یہ قلمی نسخہ یقیناً مطبوعہ دیوان سے پہلے کا ہے۔ قلمی نسخے کی نظموں کا مطبوعہ نسخے کے ساتھ مقابلہ کرنے پر اندازہ ہوا کہ نظیر کی نظم 'بنجارا نامہ' کے دو بند جو قلمی نسخے میں موجود تھے، مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں تھے۔ راقم الحروف نے وہ قلمی نسخہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو بھیجا جو اس وقت دلی

اڑیسہ اسٹیٹ آرکائیوز بھوبنیشور میں محفوظ ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ نظیر اکبرآبادی کے انتقال کے صرف ستائیس سال کے اندر ان کا کلام اڑیسہ جیسے دور دراز علاقے کے معصوم پور جیسے دور افتادہ گاؤں تک پہنچ چکا تھا۔ ۱۸۹۰ء کے لگ بھگ ریل لائن پہلی بار اڑیسہ پہنچی۔ اس زمانے میں معصوم پور گاؤں سے دارالحکومت کٹک تک تیس کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنے کے لیے بیل گاڑی کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں تھا اور بیل گاڑی کے ذریعے اتنی دوری عبور کرنے کے لیے رات بھر لگ جاتی تھی۔ یہاں کے دیہاتی لوگ کروسن کے بجائے پولانگ کے بیج کا تیل جلاتے تھے اور ماچس کے بجائے چقماق سے پتھر کو گھس کر آگ نکالتے تھے، ایسی صورت میں نظیر اکبرآبادی کے انتقال کے چند ہی سال

نظیر اکبرآبادی: نئی شعریات اور قدرِ ثانی

(پہلی قسط)

پروفیسر کرامت علی کرامت (رحمت علی بلڈنگ، دیوان بازار، کٹک-753001)

یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ ڈاکٹر نارنگ نے بہت چھان بین کے بعد یہ کہہ کر وہ قلمی نسخہ واپس کر دیا کہ تلاش کے بعد بالآخر یہ دونوں بند نظیر اکبرآبادی کے مطبوعہ نسخے میں موجود پائے گئے، لہٰذا اس قلمی نسخے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ وہ قلمی نسخہ فی الحال

کے اندر ان کے کلام کا اڑیسہ کے اندرونی علاقے تک پہنچنا یقیناً حیرت انگیز واقعہ ہے۔ مذکورہ کلام یقیناً ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ ہوتے ہوئے سیلانی طبیعت والے فقیر فقرا کے ذریعے یہاں پہنچا ہوگا۔ اس چھوٹے سے واقعے سے قارئین کرام کو نظیر اکبرآبادی کی عوامی

مقبولیت کا اندازہ لگ گیا ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ نظیر چلتے پھرتے نظمیں لکھ کر لوگوں کو دے دیا کرتے تھے۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ان کے کلام کا کچھ حصہ تلف ہو گیا تو کچھ حصہ عوام کے ہاتھوں دور دور تک پہنچتا رہا اور وہاں کے لوگوں میں نسل در نسل محفوظ رہا۔

اب اس بنیادی سوال پر آیئے کہ خود نظیر کی عوامی مقبولیت مسلم سہی، خواص میں بحیثیت شاعر ان کا کیا مقام ہے؟ یعنی شاعری کے تسلیم شدہ معیاری اصول کے تحت نظیر دیگر تمام شاعروں کے درمیان کہاں کھڑے نظر آتے ہیں؟ نظیر اکبرآبادی کی شخصیت اور شاعری دونوں شروع ہی سے متنازعہ رہی ہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں اور نقادوں نے نظیر کو ایک بازاری قسم کا شاعر کہہ کر نظرانداز کر دیا۔ غالب کے قریب ترین دوست مصطفیٰ علی خاں شیفتہ نے اپنی کتاب 'گلشنِ بے خار' میں لکھا ہے کہ ''نظیر اکبرآبادی کی شاعری بازاری ہے، اس لیے انھیں شاعروں میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے''۔ 'گلشنِ بے خار' کے جواب میں میر قطب الدین باطن نے ایک تذکرہ 'گلشنِ بے خزاں' لکھا جس میں غالب کو نیچا کر کے دکھایا گیا ہے۔ اس سے غالب کے طرف داروں اور نظیر کے مداحوں کے درمیان چشمک کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ محمد حسین آزاد اور حالی جو اردو میں نظم گوئی کے مبلغ تھے، انھوں نے بھی نظیر کی نظموں کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ شبلی بھی نظیر کے ابتذال پر نالاں ہیں۔ لہٰذا پروفیسر احتشام حسین نے بجا فرمایا ہے کہ ''نظیر نے عوام کے جذبات کی ترجمانی کی تو عوام نے نظیر کو زندہ رکھا۔ اردو شاعری کی معیار پرستی نے نظیر کو ختم ہی کر دیا تھا، اگر فقیروں اور گداگروں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں نے ان کے 'بنجارہ نامہ'، 'آدمی نامہ' اور دوسری نظموں کو یاد نہ رکھا ہوتا''۔

نظیر اکبرآبادی کے انتقال کے تقریباً سو سال کے بعد موصوف کا دوبارہ احیا ہوا، یعنی ان کی شاعری کے تعینِ قدر کی از سرِ نو کوشش کی گئی۔ اس عمل میں 'کلیاتِ نظیر' کے مرتب اور 'زندگانی بے نظیر' کے مصنف پروفیسر عبدالغفور شہباز، پروفیسر ضیا احمد بدایونی، نیاز فتح پوری، سیماب اکبرآبادی وغیرہ پیش پیش رہے۔

پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی انجمن ترقی اردو (ہند) کے صدر منتخب

ڈی پی ایس متھرا روڈ کے پرنسپل محمد اقرار حسین، مشہور شاعر کیدارناتھ سنگھ اور مشہور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالرشید نئے اراکین

نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو (ہند) کی مجلسِ عام اور مجلسِ عاملہ کا ایک مشترکہ اجلاس ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو اردو گھر میں منعقد ہوا، جس میں تمام اراکین نے اتفاقِ رائے سے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب سے جو انجمن کے سینئر نائب صدر اور کافی عرصے سے کارگزار صدر تھے، درخواست کی کہ وہ صدارت کے عہدے کو قبول کر کے انجمن کی آئندہ کی سرگرمیوں اور خدمات میں ایک اہم اور روشن باب کا اضافہ کریں، جسے قدوائی صاحب نے قبول کر لیا۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی دہلی یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں درس و تدریس کی خدمات انجام دے چکے ہیں اور اس وقت وہ متعدد علمی و ادبی تنظیموں سے وابستہ ہیں۔

مجلسِ عاملہ نے متفقہ طور پر دہلی پبلک اسکول، متھرا روڈ، نئی دہلی کے پرنسپل جناب محمد اقرار حسین، ہندی کے مشہور شاعر اور ادیب پروفیسر کیدارناتھ سنگھ نیز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے فاصلاتی تعلیم کے شعبے کے استاد اور مشہور ماہر لسانیات پروفیسر عبدالرشید کو مجلسِ عام کے اراکین کے طور پر منتخب کیا۔

(یہ پریس ریلیز انجمن نے ۲۸ر دسمبر ۲۰۱۲ء کو جاری کی)

کلیم الدین احمد جنھوں نے پوری اردو غزل اور قصیدے سے انکار کر دیا تھا، یہ کہہ کر اردو والوں کو چونکا دیا کہ "اردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبرآبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے"۔ پھر ترقی پسند تحریک کے بعد تو نظیر کے شعری سرمایے کو کلاسک کا درجہ مل گیا۔ مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین، اختر اورینوی، سجاد ظہیر، سردار جعفری، ظ۔ انصاری، محمد حسن اور قمر رئیس جیسے ترقی پسند نقادوں نے اپنی تنقید کے ذریعے نظیر کو زندۂ جاوید بنا دیا، لیکن اصل سوال یہ رہ جاتا ہے کہ کیا شعریات کے مسلمہ اصول کے تحت نظیر کو پرکھا جاسکتا ہے یا ان کی شاعری کو جانچنے کے لیے ایک نئی شعریات قائم کرنے کی ضرورت ہے؟ آپ نظیر کی نظمیں پڑھتے جائیے، ان کا تقریباً ہر مصرع 'بیانیہ' نظر آئے گا جس پر سپاٹ، ہموار اور مسطح (Flat) ہونے کا شائبہ ہوگا۔ آپ ان کے صحرائے شاعری میں دور دور تک نکل جائیے، بہت کم کہیں تشبیہ، استعارہ، پیکر یا علامت جیسے کسی جدلیاتی لفظ (dialectical word) کا شجر نظر آئے گا جس کی موجودگی کو شمس الرحمٰن فاروقی جیسے جدید نقاد شاعری کے لیے ضروری بلکہ ناگزیر سمجھتے ہیں۔

چوں کہ کلیم الدین احمد وقتاً فوقتاً چونکا دینے والے بیانات دیتے رہتے ہیں، اس لیے انھوں نے نظیر کو آسمانِ شاعری کا تنہا درخشاں ستارہ بتا کر ان کے تمام متقدمین اور متاخرین کا مرتبہ گھٹا دیا، لیکن سچ پوچھیے تو نظیر کی نظمیں کلیم الدین احمد کے بنائے ہوئے تنقیدی اصول پر بھی پوری نہیں اترتیں۔ مسدس اور مخمس کی شکل میں لکھی گئی نظیر کی نظموں میں تسلسل تو ہوتا ہے، لیکن کوئی نظم مکمل طور پر بندشت (Compact) نہیں ہوتی، یعنی کسی بند کو کہیں سے بھی ہٹایا جاسکتا ہے اور مجموعی تاثر کو مجروح کیے بغیر بند آگے پیچھے بھی ہوسکتے ہیں، اسی لیے ان نظموں میں خیالات کے عروج اور انتہا کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ وہ تمام حربے جو کلیم الدین احمد اردو کے تمام دیگر شاعروں کو مسترد کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں، ان سب سے صرفِ نظر کرتے ہوئے نظیر اکبرآبادی کو خصوصی رعایت بخشتے ہیں اور انھیں سب سے اہم شاعر گردانتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کلیم الدین احمد اپنے بنائے ہوئے تنقیدی اصول کو ایمان داری کے ساتھ صحیح طور پر نظیر کی نظموں پر منطبق کرتے تو شاید انھیں نظیر کو بھی مسترد کرنا پڑتا۔ اقبال کا قول کہ "برہنہ حرف نہ گفتن کمالِ گویائی است" بڑی حد تک درست، لیکن نظیر کی برہنہ گفتاری میں وہ کیفیت ہوتی ہے جو انسانی جذبات کے سمندر میں اتھل پتھل مچا دیتی ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ جدید نقادوں کے ذریعے نظیر کی برہنہ گفتاری کی ابھی تک کوئی شعریات مرتب نہیں ہوسکی۔ ہمارے شعروادب کی تاریخ میں کلام نظیر کو اب کلاسک کا درجہ مل چکا ہے، جس کی وجہ سے اس کی اہمیت کو انکار کرنا غالباً اب کسی کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ اس کا مطلب

انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں اور اشخاص کی ای میل آئی ڈیز

انجمن ترقی اردو (ہند) کے مختلف شعبوں اور متعلقہ اشخاص کی نئی ای میل آئی ڈیز درج ذیل ہیں۔ محبانِ اردو اور خیرخواہانِ انجمن سے درخواست ہے کہ اب وہ انجمن کے مختلف شعبوں کے متعلقہ اشخاص سے اُن کے ای میل پتے پر ہی رابطہ کریں۔ پرانی ای میل آئی ڈی ساقط کردی گئی ہے۔

- صدر (صدیق الرحمٰن قدوائی): president@anjumantaraqqiurduhind.org
- نائب صدور (سید شریف الحسن نقوی اور خلیق انجم): vicepresident@anjumantaraqqiurduhind.org
- جنرل سکریٹری (اطہر فاروقی): gen.secretary@anjumantaraqqiurduhind.org, ather.farouqui@anjumantaraqqiurduhind.org
- ہماری زبان: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
- بک ڈپو: bookdepot@anjumantaraqqiurduhind.org
- مدیر سہ ماہی 'اردو ادب' (اسلم پرویز): aslam.parvez@anjumantaraqqiurduhind.org
- اکاؤنٹ آفیسر (مظہر عباس نقوی): mazahr.naqvi@anjumantaraqqiurduhind.org
- ایڈمنسٹریٹو آفیسر (ثاقب صدیقی): saquib.siddiqui@anjumantaraqqiurduhind.org
- ایڈمنسٹریٹو آفیسر اور لائبریرین (شاہد خاں): shahid.khan@anjumantaraqqiurduhind.org
- انچارج بک ڈپو اور آرکائیوز (انیس احمد): anis.ahmed@anjumantaraqqiurduhind.org
- شریک مدیر 'ہماری زبان' (محمد عارف خان): arif.khan@anjumantaraqqiurduhind.org
- پی۔ اے۔ ٹو جنرل سکریٹری (جاوید رحمانی): jawaid.rahmani@anjumantaraqqiurduhind.org

یہ ہوا کہ ہمارے نقادوں کی جھولی میں جتنے تنقیدی اصول پڑے ہوئے ہیں، ان پر نظرِ ثانی کر کے ان کے زاویۂ نقد و نظر کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ نظیر کی شاعری کی دلکشی و دلآویزی کا راز جاننے کے لیے نہ 'جدلیاتی لفظ' کی تھیوری کام آسکتی ہے، نہ 'ابتدا، عروج و انتہا' کا مفروضہ معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ البتہ راقم الحروف کی وضع کردہ 'اضافی تنقید' کی تھیوری ہی کو رہنما اصول کے طور پر قبول کیا جائے تو یہ گتھی باآسانی سلجھ سکتی ہے۔ شاعری میں 'لفظ و معنی' کے رشتے پر غور کرنے سے پتا چلے گا کہ ہر لفظ کے اردگرد اس کے لغوی معنی کے علاوہ ان کے متحرک انسلاکات کے ہالے ہوتے ہیں، لیکن یہ شاعری کے اصل معنی نہیں ہوتے۔ شعر کی قرأت کے دوران مختلف الفاظ کے درمیان جو خلا (Gap) ہوتا ہے، اسی میں شاعری کے اصل معنی پوشیدہ ہوتے ہیں اور یہ اس وقت سامنے آتے ہیں جب قاری عقل و جذبات کی مدد سے اس خالی پن کو پُر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہی کوشش شعر کی معنوی کیفیات اور جذباتی کیفیات کے ابلاغ میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کیفیات کے ابلاغ کے دوران جذبات کی اضافی فراوانی (Relative excess) ہوتو ہم اس ادبی تخلیق کو 'اچھی شاعری' کے زمرے میں شامل کریں گے، ورنہ نہیں۔ یہی 'اضافی تنقید' کی شعریات کا نچوڑ ہے۔ اس شعریات کے اعتبار سے اگر کوئی شعر یا نظم بظاہر سپاٹ اور محض بیانیہ بھی ہو تو اس پر گہرائی سے غور کرنے سے بعض اوقات مذکورہ بالا خصوصیت کی دریافت مشکل نہیں ہوتی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو نظیر کی بیشتر تخلیقات کو ان کے بیانیہ اسالیب کے باوجود 'اچھی شاعری' کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ (باقی آئندہ)

اردو اور فارسی ادب کا محسن

منشی نول کشور

سیّد طلحہ نقشبندی القادری (کتب خانہ خانقاہ نقشبندیہ، بالاپور، ضلع اکولہ، مہاراشٹر)

۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد اگر سرسید احمد خاں مرحوم اور منشی نول کشور ہندستان کے تمدنی ورثے اور ذہنی بیداری کی حفاظت نہ کرتے تو شاید ہندستان آج ترقی کی دوڑ میں اس طرح جدید اقوام کے ساتھ شانے جوڑ کر نہیں بڑھ سکتا تھا۔ سرسید مرحوم مغربیت کے دلدادہ تھے اور ان کا اعتقاد تھا کہ مغرب کے نقشِ قدم پر چلنے ہی میں ہندستان کی نجات ہے۔ چناں چہ علی گڑھ تحریک سے بھی پہلے آپ کا اولین کارنامہ غازی پور کی وہ انجمن تھی جسے سائنٹفک سوسائٹی کا نام دیا گیا تھا اور جس میں غیرممالک کے علوم وفنون کی کتابوں کو اردو میں منتقل کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا لیکن مغربی علوم کے علاوہ ہندستانیوں کا اپنا بھی بیش بہا ادب تھا جو ملک کی مختلف زبانوں میں زیادہ تر فارسی و عربی، قلمی نسخوں کی شکل میں محفوظ تھا۔ اگر منشی نول کشور ان نایاب قلمی مخطوطات ومطبوعات کی کھوج وجستجو کر کے ان کی اردو فارسی میں طباعت کے ذریعے زندۂ جاوید نہ بنا دیتے تو ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں ان تمام کی تباہی یقینی تھی اور یہ ہمارے تمدن کا اتنا زبردست نقصان ہوتا جس کی تلافی صدیوں تک ممکن نہ تھی۔

منشی نول کشور کے والد بابو جمنا پرشاد بھارگو علی گڑھ کے قریب موضع ساسنی کے ایک بڑے رئیس تھے۔ ان کے پانچ بیٹے تھے جن میں منشی نول کشور دوسرے تھے۔ وہ دسمبر ۱۸۳۶ء میں متھرا کے نزدیک ریدھا گاؤں میں پیدا ہوئے۔ چھ سال کی عمر میں انھوں نے اپنے وطن ساسنی آکر پڑھنا شروع کیا۔ نول کشور میں ابتدا ہی سے غیرمعمولی ذہانت کے آثار پائے جاتے تھے، چناں چہ دس سال کی عمر میں وہ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہو کر آگرہ چلے گئے جہاں انھوں نے کالج میں داخلہ لیا۔ پندرہ سال کی عمر

میں آپ کو مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اس زمانے میں آگرہ سے "آگرہ سفیر" نامی ایک اخبار نکلتا تھا جو شمالی ہند میں بہت مشہور تھا۔ نول کشور نے اس میں لکھنا شروع کیا اور سلسلۂ تعلیم منقطع کر دیا۔ ان کے مضامین عوام الناس میں کافی مقبول ہوئے۔ اسی زمانے میں لاہور میں "مطبع کوہِ نور" نامی ایک پریس تھا جس کے مالک منشی ہرسکھ رائے تھے جو اپنی دیانت داری اور نیک نیتی کے لیے معروف تھے۔ نول کشور کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہو کر انھوں نے نول کشور کو اپنے مطبعے میں کام کرنے کی دعوت دی۔ چناں چہ سترہ سال کی عمر میں نول کشور لاہور جا کر منشی ہرسکھ رائے کے شریک کار ہو گئے، منشی ہرسکھ رائے کو ان پر اس قدر اعتماد ہو گیا کہ اپنا سارا کاروبار ان ہی کے ذمے چھوڑ کر خود سکھ و اطمینان کی نیند سونے لگے۔ چار سال تک نول کشور مطبع کوہِ نور میں کام کرتے رہے، لیکن 21 سال کی عمر میں آپ کے خیالات میں انقلاب شروع ہوا، یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں ہر طرف جہالت، بھوک، افلاس اور بے روزگاری کا دور دورہ تھا۔ قدیم اخلاقی، تہذیبی اور سماجی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور عوام جو نئی قدروں کو قبول کرنے سے منحرف تھے، عجیب کشمکش و پیچ کے عالم میں تھے۔ وطن عزیز کی یہ تباہی نول کشور کو ایک لمحے کے لیے چین نہ لینے دیتی تھی۔ وہ یہ سوچتے رہتے کہ وہ انسان ہی کیا جو اپنی قوم اور اپنے ملک کی بہتری کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ چناں چہ آپ نوکری سے دستبردار ہو گئے اور عوام کی خدمت کے لیے ایک ذاتی مطبع کھولنے کی فکر و کاوش کرنے لگے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی چنگاری سرد پڑنے کے بعد نول کشور لکھنؤ آ گئے۔ مہذب انسانوں کی یہ بستی انھیں خوب بھا گئی۔ ہر علم اور ہر فن کے لوگ یہاں ملتے تھے اور اس دیار میں تعلیم اور ادب کی قدر تھی۔ چناں چہ نول کشور نے اپنے کام کے لیے اس جگہ کو منتخب کیا۔ مقامی حکام سے مل کر انھوں نے "گوئن غالب گنج" میں مطبع منشی نول کشور کے نام سے ایک پریس قائم کر دیا اور "اودھ اخبار" کا اجرا کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ان کے اخبار نے غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی۔ ملک بھر میں صحیح و تازہ خبریں دینے کے لیے اودھ اخبار مشہور تھا۔ اس اخبار نے منشی نول کشور کے نام کو چمکا دیا۔

ارباب اقتدار میں بھی ان کی قدر دانی ہونے لگی۔ طباعت کا تقریباً سارا سرکاری کام مطبع نول کشور کے سپرد ہو گیا۔ محکمۂ تعلیم کے لیے نصاب کی کتابیں بھی یہاں چھپنے لگیں اور چند ہی عرصے میں یہ ملک کا سب سے بڑا پریس بن گیا۔

اب منشی نول کشور کی توجہ اس بیش بہا خزانے کی طرف مبذول ہوئی جو قلمی نسخوں کی شکل میں تباہی و گمنامی کے غار میں پڑا ہوا تھا۔ آپ نے بڑی بڑی رقمیں خرچ کر کے اردو، فارسی اور سنسکرت کی اعلا کتابیں بہم پہنچائیں اور مختلف زبانوں کے ادیب کو ملازم رکھ کر نئے سرے سے ان کی تالیف و ترجمے کا کام شروع کرایا اور رفتہ رفتہ وہ کتابیں جو کسی قیمت پر بھی دستیاب نہ ہوتی تھیں، صرف چند روپیوں کے عوض خاص و عام کو میسر ہونے لگیں اور اردو و فارسی کا بہت بڑا ادب طباعت کے زیور سے آراستہ ہو کر محفوظ ہو گیا۔

چار سو سالہ قدیم مرکز علمی و ادبی معارف و حقائق کی ایک یادگار خانقاہ نقشبندیہ کے بین الاقوامی معروف کتب خانہ بالاپور ضلع آکولہ مہاراشٹر میں مطبع نول کشوری کی معروف و نایاب کتب آج بھی صحیح و سالم موجود ہیں ان کے نام ہم یہاں درج کر رہے ہیں تاکہ ہماری نئی نسل ان سے واقف ہو جائے:

۱- تاریخ فرشتہ ستمبر ۱۹۱۲ء
۲- سفینۃ الاولیا نومبر ۱۹۰۰ء
۳- خزانۂ عامرہ مئی ۱۹۰۰ء
۴- نفحن شعرا اکتوبر ۱۸۷۳ء
۵- مثنوی مولوی روم جنوری ۱۸۷۷ء
۶- شرح ملا جامی جون ۱۸۷۶ء
۷- گنج فارسی جولائی ۱۸۷۱ء
۸- بہار عجم (دو جلد) ستمبر ۱۸۷۹ء
۹- سراج و قراج (۲ جلد) فروری ۱۸۸۳ء
۱۰- برہان قاطع نومبر ۱۸۹۱ء
۱۱- غیاث اللغات ستمبر ۱۸۹۰ء
۱۲- منتخب اللغات ستمبر ۱۸۸۳ء
۱۳- عجائب القصص ستمبر ۱۸۹۶ء
۱۴- احوال الانبیا (۲ جلد) مارچ ۱۸۸۶ء
۱۵- خاتم الطبع بستان حکمت جنوری ۱۹۲۳ء
۱۶- مختصر الوقایہ اپریل ۱۸۸۷ء
۱۷- شرح خسرو آملی ۱۸۷۷ء
۱۸- تاریخ زر دہ بارہ جنتی جنوری ۱۹۰۳ء
۱۹- زاد آخرۃ جون ۱۸۹۸ء
۲۰- تحفۃ المرحین جولائی ۱۸۹۸ء
۲۱- شاہنامہ فردوسی اکتوبر ۱۸۸۶ء
۲۲- شاہنامہ فردوسی دسمبر ۱۸۸۸ء
۲۳- مصباح المنیر جون ۱۸۹۸ء
۲۴- غایۃ الاوطار (۲ جلد) فروری ۱۸۷۶ء
۲۵- حدائق البلاغۃ مارچ ۱۸۸۰ء
۲۶- جامع الاخلاق اگست ۱۸۷۵ء
۲۷- مغازی الصادقہ ۱۸۷۳ء
۲۸- حدائق الحظ فروری ۱۸۹۱ء
۲۹- گلستان سخن اپریل ۱۸۸۳ء
۳۰- شرح الیاس مئی ۱۸۸۴ء
۳۱- انیس الصالحین ستمبر ۱۸۸۸ء
۳۲- مناصر الشاہ جہان مئی ۱۹۰۵ء
۳۳- جامع الاحکام اکتوبر ۱۸۸۷ء
۳۴- شرح سکندر نامہ فروری ۱۸۸۹ء
۳۵- مغازی الرسول اگست ۱۸۸۹ء
۳۶- فتوح الشام اگست ۱۸۸۹ء
۳۷- فتوح العجم اکتوبر ۱۸۸۹ء
۳۸- اخلاق ناصری اکتوبر ۱۸۸۳ء
۳۹- خزینۃ الاصفیاء اگست ۱۸۹۳ء
۴۰- انوار سہیلی مئی ۱۸۷۶ء
۴۱- قصائد بدر چاچ جون ۱۸۸۴ء
۴۲- قصائد عرفی جون ۱۸۷۷ء
۴۳- مجالس العشاق جولائی ۱۸۷۶ء
۴۴- زینت الخلیل جون ۱۸۸۴ء
۴۵- کلیات قدسیہ مارچ ۱۸۹۰ء
۴۶- تحفۃ الانسان جنوری ۱۸۸۳ء
۴۷- فرہنگ تقریریہ دسمبر ۱۸۸۴ء
۴۸- خصائل السعادت اکتوبر ۱۸۸۵ء
۴۹- اسرار الحروف مارچ ۱۸۹۰ء
۵۰- شرح عقائد النسفیہ فروری ۱۸۸۵ء
۵۱- اسرار الاولیا مارچ ۱۹۰۶ء
۵۲- فوائد سعدیہ جون ۱۸۸۵ء

منشی نول کشور کو خدمت خلق کا بھی شوق تھا۔ آپ نے غربا کے علاج کی خاطر حکیم، وید اور ڈاکٹر رکھے تھے جو غریبوں کو دوا مفت تقسیم کرتے اور ان تمام کا خرچ مطبع نول کشور کے ذمے تھا، اس کے علاوہ انھوں نے غریب طلبہ کی تعلیم کے لیے متعدد وظائف مقرر کر دیے تھے۔ حکومت نے منشی صاحب کی اچھی خدمات سے خوش ہو کر ان کو اودھ کے درباریوں میں نامزد کیا اور سی آئی ای کے معزز خطاب سے سرفراز کیا، اس کے علاوہ آپ الٰہ آباد یونیورسٹی کے کورٹ کے ممبر، لکھنؤ میونسپلٹی کے ممبر اور آنریری انسپکٹر جیل مقرر ہوئے۔

آخر 58 سال کی عمر میں ۱۸۹۵ء میں منشی نول کشور شرما نے انتقال کیا۔

•••

راجیہ سبھا میں اردو کے حق میں صدائے احتجاج بلند

اردو کو ملک کی دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے

محمد عارف خاں

آزادی کے بعد اردو کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی ایک لمبی داستان ہے۔ اس میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں اور ان کے اہل کاروں کے متعصبانہ رویّوں کے علاوہ خود ہم اردو والوں کی اردو سے غفلت اور بے اعتنائی کا بھی بڑا دخل ہے۔ ہم ان ناانصافیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے بھی کتراتے ہیں۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ اب گاہے بگاہے اردو کے حق میں ملک کی مقتدر شخصیتوں کی بھی آوازیں بلند ہونے لگی ہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۱ دسمبر ۲۰۱۲ء کو راجیہ سبھا میں رونما ہوا، راجیہ سبھا کے معزز رکن جناب چودھری منور سلیم نے اردو زبان کے ساتھ گزشتہ ۶۳ برسوں سے کی جانے والی زیادتیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ ہندستان میں پیدا ہونے والی اس زبان کو ملک کے سرکاری کام کاج میں دوسری زبان (Official Language of the Union) کا درجہ دیا جائے۔ ابھی تک ہندی اس منصب پر انگریزی کے ساتھ براجمان ہے۔ اس کی ترقی کے لیے مرکزی کمیشن قائم کیا جائے، اس کی ترویج و توسیع کے لیے الگ سے بجٹ مختص کیا جائے نیز اردو اخبارات کی حوصلہ افزائی کے لیے زیادہ سے زیادہ سرکاری اشتہارات دیے جائیں اور مرکزی سطح پر اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا انتظام اور اہتمام کیا جائے۔

خوشی کی بات یہ ہے کہ راجیہ سبھا میں جناب منور سلیم کی طرف سے کیے گئے ان مطالبات کا سماج وادی پارٹی کے علاوہ بھارتیہ جنتا پارٹی، بہوجن سماج پارٹی، کانگریس اور ترنمول کانگریس سمیت زیادہ تر پارٹیوں کے اراکین پارلیمنٹ نے خیر مقدم کیا۔ چودھری منور سلیم نے پارلیمنٹ میں ضابطہ ۱۸۰ کے تحت اردو کے حق میں آواز بلند کی۔ موصوف نے اردو کی دردبھری کہانی اپنے الفاظ میں یوں بیان کی: "میں آج ایک ایسی زبان سے متعلق معاملے کو ایوان میں پیش کرنا چاہتا ہوں جس کی پیدائش و پرداخت اسی سرزمین پر ہوئی، یہیں جوان ہوئی اور اب یہیں سسک سسک کر بھارت ماتا کے سپوتوں سے کہہ رہی ہے کہ میں اردو ہوں، میں نے ہی 'انقلاب زندہ باد' کا نعرہ دے کر آزادی کے متوالوں میں جنون پیدا کیا تھا، میں نے ہی کہا تھا 'سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے'۔ میں ہی وہ اردو ہوں جس نے اپنی تحریروں سے مولانا آزاد کے اخبار 'الہلال' اور جواہر لعل نہرو کے 'قومی آواز' کے ذریعے ملک کی آزادی کی اہمیت ملک کے عوام کو سمجھائی تھی۔ میں آپ کی وہ عوامی زبان اور بھائی چارے کی علامت ہوں جس نے کہا تھا کہ 'مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا' اور یہ بھی کہا تھا کہ 'سارے جہاں سے اچھا ہندستاں ہمارا'۔" چودھری منور سلیم نے مزید کہا کہ "میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اردو کسی مذہب کی زبان نہیں ہے بلکہ یہ برج نرائن چکبست، دیا شنکر نسیم، نریش کمار شاد، منشی پریم چند اور رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کی زبان ہے۔ اس لیے اس زبان کی ترقی کے لیے حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہوں کہ اردو کو سرکاری کام کاج میں دوسری زبان کا درجہ دیا جائے اور مرکزی سطح سے اردو زبان کو اسکولوں میں تعلیم دینے کے لیے خصوصی نظم اور کوشش کی جائے"۔

اردو سے محبت اور لگاؤ رکھنے والے تمام ممبران پارلیمنٹ سے بھی درخواست ہے کہ وہ چودھری منور سلیم کی آواز میں آواز ملا کر اور ایک متحدہ پلیٹ فارم بنا کر اردو کے جائز مطالبات کو حکومت سے منوانے کی کوشش کریں اور جب تک یہ مطالبات تسلیم نہ کر لیے جائیں اپنی جدوجہد کو مسلسل جاری رکھیں۔

اردو دُنیا

اب اردو میں بھی لگیں گی ناموں کی تختیاں

لکھنؤ (۲۲ دسمبر)۔ سرکاری دفاتر میں ناموں کی تختیاں اب اردو میں بھی لگائی جائیں گی۔ اردو میں ناموں کی تختیاں لگانا لازمی کر دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں سکریٹریٹ انتظامیہ نے جمعرات کو ایک حکم نامہ جاری کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ وزیر اعلا، تمام وزرا، پرنسپل سکریٹریوں، سکریٹریوں، اسپیشل سکریٹریوں اور محکموں کے سربراہوں سمیت سبھی سرکاری دفاتر میں ہندی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی ناموں کی تختیاں لگانا لازمی کر دیا گیا ہے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

اردو میں ساہتیہ اکادمی کا یُوا ایوارڈ ۲۰۱۲ء غضنفر اقبال کو

19 هندستانی زبانوں کے نوجوان ادیب ایوارڈ کے لیے منتخب

نئی دہلی (۲۱ دسمبر)۔ ساہتیہ اکادمی کے کارگزار صدر وشوناتھ پرشاد تیواری کی صدارت میں کل ساہتیہ اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی میٹنگ ہوئی جس میں 19 ہندستانی زبانوں کے یُوا ایوارڈ ۲۰۱۲ء کے لیے کتابوں کے انتخاب کو منظوری دی گئی۔ اردو میں یُوا ایوارڈ کے لیے جواں سال قلم کار غضنفر اقبال کو ان کی کتاب 'سمتِ مضمون' کے لیے منتخب کیا گیا۔ غضنفر اقبال کی آٹھ کتابیں اب تک منظرِ عام پر آ چکی ہیں جن میں 'اردو افسانہ: ۱۹۸۰ء کے بعد'، 'سفر بار روش'، 'ان کہی باتیں'، 'گلوبل انفارمیشن'، 'خاک کے پردے سے' اور 'حمید سہروردی کے افسانوں کا تجزیاتی مطالعہ' قابلِ ذکر ہیں۔ جناب غضنفر اقبال کا تعلق گلبرگہ (کرناٹک) سے ہے۔ ان کی کتابوں پر اترپردیش اردو اکادمی، بہار اردو اکادمی اور مہاراشٹر اردو اکادمی کی جانب سے انعامات مل چکے ہیں۔ دیگر انعام یافتگان میں صادق حسین (بنگلہ)، عارف رضا (کنڑ)، فاروق شاہین (کشمیری)، امن سیٹھی (انگریزی)، کومل سنگھ (ہندی)، ادم ناگر (راجستھانی)، لیش رینا (ڈوگری) اور ارونابھ سوربھ (میتھلی) وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ سندھی کو چھوڑ کر باقی چار ہندستانی زبانوں منی پوری، نیپالی، سنتالی اور تیلگو میں ایوارڈ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ یہ ایوارڈ ان کتابوں کے لیے دیے گئے ہیں جن کے لکھنے والوں کی عمر یکم جنوری ۲۰۱۲ء کو 35 سال یا اس سے کم ہے۔ یہ ایوارڈ پچاس ہزار روپے اور توصیف نامے پر مشتمل ہے۔ یہ انعامات ساہتیہ اکادمی کی ایک پُروقار تقریب میں دیے جائیں گے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

پرائمری اسکولوں میں اردو ٹیچروں کے بندوبست کا مطالبہ

باغپت (۲۱ دسمبر)۔ ضلع میں اردو کے نام پر پرائمری اسکولوں میں بھرتی ہوئے بعض اردو سے ناواقف ٹیچروں کی طرف سے اب انٹر کالجوں میں بھی اردو ٹیچر کی حیثیت سے تقرر کا مطالبہ زور پکڑنے لگا ہے۔ آل انڈیا اردو تنظیم نے اس پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب پرائمری سطح پر اردو تعلیم کا کوئی مناسب انتظام نہیں ہے اور جو اساتذہ تقرر ہوئے ہیں ان میں بڑی تعداد اردو کے ناواقف ٹیچروں کی ہے تو ایسے میں انٹر کالجوں میں اردو ٹیچروں کی تقرری کیا معنی رکھتی ہے۔ اردو تنظیم کی طرف سے جاری ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ کچھ سال پہلے اردو کے نام پر سرکاری دفتروں اور کچھ پرائمری اسکولوں میں ایسے افراد تقرر ہو گئے تھے جو اردو کے ایک لفظ سے بھی واقف نہیں ہیں، ان میں غیر مسلموں کی بھی کافی تعداد بتائی گئی ہے، جنھوں نے کسی طرح کہیں سے کوئی اردو کی سند یا سرٹیفکٹ حاصل کر کے اس دوران مقرر ہوئے ہیں۔ پرائمری سطح پر کم از کم مسلم آبادی کے حلقوں میں واقع اسکولوں میں اردو تعلیم کا بندوبست کیا جائے اور وہاں ایسے ٹیچروں کی تقرری کی جائے جو صحیح معنوں میں اردو سے واقف ہوں۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

پولیس قوانین میں اردو کے الفاظ آج بھی رائج

سنبھل (۲۴ دسمبر)۔ آزادی کے تقریباً 65 سال گزرنے کے بعد بھی اترپردیش پولیس قوانین انگریزوں کے زمانے کے ہی رائج ہیں، ان قوانین میں اردو کے الفاظ بھی شامل ہیں۔ امروز، مال مسروقہ، روزنامچہ خاص، روزنامچہ عام، تفتیش، مصروف اور مشہور جیسے الفاظ شامل ہیں جنھیں عام اردو والوں کے لیے سمجھنا تو مشکل نہیں ہے لیکن نئی بھرتی ہونے والے پولیس اہلکاروں کے لیے یہ پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ ۱۸۶۱ء میں جب انگریزوں نے پولیس قوانین نافذ کیے تھے تب ہندستان منقسم نہیں ہوا تھا۔ پشاور سے لے کر کنیا کماری تک اردو، فارسی عام استعمال کی زبانیں تھیں۔ شاید اسی وجہ سے تب قوانین میں اردو، فارسی اور عربی کے الفاظ شامل کیے گئے تھے جو کہ آج تک رائج ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملنے کے بعد بھی قوانین کو نافذ کیا گیا حالاں کہ آئین میں تبدیلی کی باتیں تو ہوئیں لیکن اس پر کام شروع نہیں ہوا۔ اردو کو ختم ہونے کی بات کہنے والوں کے لیے یہ بات حیرانی بھری ہو سکتی ہے کہ پولیس اہلکاروں کو ٹریننگ دینے کے دوران اردو کے الفاظ کی بھی تربیت دی جاتی ہے، اس سے نہ صرف اردو کے زندہ رہنے کی امید بندھتی ہے بلکہ اردو کی اہمیت پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دیگر زبانوں میں ان الفاظ کے بہتر متبادل نہیں مل سکے۔

(راشٹریہ سہارا۔ دہلی)

انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی تشکیل نو

پروفیسر قیصر شمیم صدر اور محمد صدیق سکریٹری منتخب

کولکاتہ (۲۳ دسمبر)۔ جناب محمد صدیق (سکریٹری انجمن ترقی اردو مغربی بنگال) نے ایک پریس ریلیز جاری کر کے کہا ہے کہ مورخہ ۲۳ دسمبر ۲۰۱۲ء کو ایک بجے دن میں اراکین انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کی ایک میٹنگ ایران سوسائٹی، کولکاتہ میں منعقد ہوئی جس کی صدارت پروفیسر قیصر شمیم نے کی۔ اس جلسے میں جناب عبدالقیوم انصاری (کوآرڈینیٹر انجمن ترقی اردو برائے مغربی بنگال) مشاہد کی حیثیت سے شامل ہوئے۔ متفقہ طور پر انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے عہدیداران اور ممبران کا انتخاب عمل میں آیا۔ اس انتخاب میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے صدر کی حیثیت سے پروفیسر قیصر شمیم، نائب صدر کے طور پر جناب عبدالجلیل (آسنسول)، جناب حفیظ الرحمن (کولکاتہ)، ڈاکٹر سعیدالدین (ذکریا اسٹریٹ، کولکاتہ)، جناب محمد اظہار عالم (ہگلی)، جنرل سکریٹری جناب محمد صدیق (۷، اے جی روڈ، چاپدانی، ہگلی)، جوائنٹ سکریٹری کے طور پر جناب ایم. اے. قاسم ملک (ہوڑہ)، جناب ماسٹر سراج الدین (کرجی)، جناب محمد علی جان ایڈوکیٹ (علی گڑھ)، ڈاکٹر نہال احمد (ذکریا اسٹریٹ، کولکاتہ) اور جناب اشفاق حسین خان خازن کی حیثیت سے منتخب ہوئے، جب کہ اراکین کے طور پر چنے گئے ممبران میں ڈاکٹر عشرت جناب (آسنسول)، جناب محمد قسیم (کرجی)، جناب محمد جلیل (علی گڑھ)، محمد سلطان انصاری (آسنسول)، جناب محمد حسین خان (کھڑگ پور)، جناب محمد مسلم (ہوڑہ)، جناب محمد اشرف رضا انصاری (کولکاتہ)، جناب غلام محمد (ہگلی)، جناب حاجی محمد جسیم الدین (راجا بازار)، ڈاکٹر واصف اختر (ہوڑہ)، جناب محمد مختار (آسنسول) اور ڈاکٹر محمد امین عامر (ہوڑہ) جناب اظہر امام (کولکاتہ) کے نام اہم ہیں۔

یہ کمیٹی مغربی بنگال میں اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے کام کرے گی۔ آج کا یہ جلسہ محترمہ ممتا بنرجی (وزیر اعلا حکومت مغربی بنگال) سے اردو اور اقلیتوں کے درج ذیل مسائل کو حل کرانے کی مانگ کرتا ہے:

۱- انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے دفتر کے لیے کولکاتہ میں اردو گھر کی تعمیر کرائی جائے۔

۲- انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کو انجمن اور اردو کے نشر و ارتقا کے لیے حکومت محکمۂ اقلیتی فلاح کی جانب سے دس لاکھ روپے سالانہ گرانٹ جاری کرے۔

۳- مغربی بنگال اردو مشاورتی بورڈ قائم کیا جائے۔

۴- اس جلسے میں متفقہ طور پر بنگال میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دینے کے فیصلے پر محترمہ ممتا بنرجی (وزیر اعلا مغربی بنگال) کا شکریہ ادا کیا گیا اور مطالبہ کیا گیا کہ جن اضلاع میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا ہے وہاں پر اردو ٹرانسلیٹر، معاون ٹرانسلیٹر اور اردو کمپیوٹر آپریٹر کی تقرری کی جائے اور اردو سافٹ ویئر کے ساتھ کمپیوٹر فراہم کرایا جائے۔ تمام سرکاری اداروں کے سائن بورڈ اور نیم پلیٹوں کو اردو میں بھی لکھا جائے، اردو میں درخواستیں قبول کی جائیں، اردو میں گزٹ نوٹیفکیشن جاری کیا جائے۔

۵- مغربی بنگال صوبے میں بہار کی طرز پر بھی پرائمری، مڈل اور سکنڈری اسکولوں میں کم سے کم ایک ایک اردو اساتذہ کی تقرری کی جائے۔

۶- مغربی بنگال کے اقلیتی اداروں میں انجمن ترقی اردو مغربی بنگال کے اراکین کی نمائندگی شامل کی جائے۔

(پریس ریلیز انجمن ترقی اردو مغربی بنگال)

اردو اساتذہ، صحافیوں، شعرا اور اُدبا کا حکومت مہاراشٹر انشورنس کرے گی

محمد عارف نسیم خان

ممبئی (۲۳ دسمبر)۔ اردو اساتذہ، صحافیوں، شعرا اور ادبا کا حکومت مہاراشٹر انشورنس کرے گی اور ان کی انشورنس کی رقم خود حکومت اپنی جیب سے ادا کرے گی۔ یہ اعلان آج یہاں مہاراشٹر کے اقلیتی امور کے وزیر محمد عارف نسیم خان نے اساتذہ کی ملک گیر تنظیم آل انڈیا آئیڈیل ٹیچرز ایسوسی ایشن کی جانب سے منعقدہ ایک کانفرنس کے دوران کیا۔ ممبئی کے پاٹکر ہال میں منعقدہ اس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ اسکیم حکومت کے زیر غور ہے اور جلد ہی اسے منظوری حاصل کرنے کے بعد نافذ کیا جائے گا۔ نسیم خان نے کہا کہ اردو اساتذۂ کرام، اردو صحافیوں اور اردو کی خدمت کرنے والے شعرا اور ادبا کو حکومت بھی سہولیات کے لیے کسی نامور انشورنس کمپنی سے ان کا انشورنس کرے گی اور اس کے پریمیم کی رقم اردو اکیڈمی سے دی جائے گی۔

(انقلاب۔ دہلی)

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہمارا کلاسکی ادب اور ترقی پسند تنقید کے موضوع پر غالب سمینار

پروفیسر محمد ذاکر، پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر آذرمی دخت صفوی، کرشن کمار طور، پروفیسر نورالعین علی اور پروفیسر کلیم عاجز غالب انعامات سے سرفراز

نئی دہلی (۱۰ دسمبر)۔ غالب ہماری شاعری کا سرسبز پھول ہے، غالب برصغیر کا سب سے پہلا ترقی پسند شاعر ہے۔ ان خیالات کا اظہار کناڈا کے معروف اسکالر ڈاکٹر تقی عابدی نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایوان غالب میں 'ہمارا کلاسکی ادب اور ترقی پسند تنقید' کے موضوع پر منعقدہ غالب سمینار کی افتتاحی تقریب میں کیا۔ اس موقع پر خواجہ حسن ثانی نظامی، عطاء الحق قاسمی، جسٹس بدر دریز احمد، ڈاکٹر پرویز احمد اور جناب عابد سہیل نے بھی بطور خاص شرکت کی۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے سمینار کے تعلق سے کہا کہ مجھے امید ہے کہ (اگلے) دو روز میں یہاں ادب کا ایسا دریا بہے گا جس سے ہر خاص و عام سیراب ہوگا۔ اس سے قبل افتتاحی تقریر میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی نے کہا کہ غالب سمینار ہر سال تازے عنوانات اور مختلف موضوعات پر منعقد کیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ غالب کے نام سے منعقد ہونے والے سمینار میں اتنی وسعت ہے کہ ہم جن موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں وہ غالب کے خواب و خیال سے ملتے ہیں۔ پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے انسٹی ٹیوٹ میں جاری سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ سمینار ہر سال غالب کے نام سے ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہونے والے پروگراموں میں ملک و بیرون ملک کے متعدد ادبا اور شعرا شرکت کر چکے ہیں۔ ان کے علاوہ جناب عابد سہیل اور پاکستان کے ڈاکٹر عطاء الحق قاسمی نے بھی اظہار خیال کیا۔

تقریری سلسلے کے بعد غالب انعامات کی تقسیم عمل میں آئی، جس میں پروفیسر عتیق اللہ کو برائے اردو تحقیق و تنقید 'فخرالدین علی احمد غالب انعام ۲۰۱۲ء'، پروفیسر آذرمی دخت صفوی کو برائے فارسی تحقیق و تنقید 'فخرالدین علی احمد غالب انعام ۲۰۱۲ء'، معروف شاعر کرشن کمار طور کو برائے اردو شاعری 'غالب انعام ۲۰۱۲ء'، پدم شری پروفیسر کلیم عاجز کو برائے مجموعی ادبی خدمات 'غالب انعام ۲۰۱۲ء'، ڈرامہ نگار پروفیسر نورالعین علی کو برائے اردو ڈرامہ 'ہم سب غالب انعام ۲۰۱۲ء' اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر محمد ذاکر کسی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکے تو ان کا غالب انعام برائے اردو نثر، غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر جناب شاہد ماہلی نے حاصل کیا۔ پروگرام میں علی گڑھ کے معروف مصور سرفراز زیدی کے ذریعے غالب کے اشعار کے پس منظر میں بنائی گئی تصاویر کی نمائش بھی کی گئی۔ اس موقع پر پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر صادق، پروفیسر شریف حسین قاسمی، جناب شفیع قریشی، ڈاکٹر یوسف عامر، جناب اصغر ندیم، جناب سید شریف الحسن نقوی، جناب افتخار الزماں، جناب جاوید رحمانی، پروفیسر بلقیس حسینی، پروفیسر ابن کنول، ڈاکٹر سہیل انور، جناب عرفان احمد، جناب سلیم امروہوی، ڈاکٹر قمر عالم، پروفیسر انیس اشفاق، ڈاکٹر سرور الہدیٰ اور ڈاکٹر خالد بشر کے علاوہ بہت سی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔ آخر میں ڈائرکٹر شاہد ماہلی صاحب نے تمام حاضرین اور مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کے خاتمے کا وقت آگیا ہے

بھوپال میں 'اردو وراثت کارواں' کا استقبال کرتے ہوئے دانشوروں کا اظہار خیال

بھوپال (۲۳ دسمبر)۔ اردو نہ صرف یہ کہ ایک خالص ہندستانی زبان ہے جس نے اس ملک کی سوندھی مٹی میں جنم لیا بلکہ اس نے ہر عہد میں ہندستان کی تہذیبی وراثت کو جلا بخشی اور کثرت میں وحدت کے نظریے کو عملی روپ دیا لیکن بدقسمتی سے تقسیم وطن کے بعد ایک سازش کے تحت اسے ایک مخصوص فرقے کے ساتھ جوڑ کر اس کی ترقی کی راہیں مسدود کرنے کی کوششیں کی گئیں تاہم اب وقت آگیا ہے کہ اس کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کا ازالہ کیا جائے۔ ان خیالات کا اظہار یہاں مختلف مذاہب اور سماجی و سیاسی پس منظر رکھنے والے دانشوروں نے کیا۔ ریاست مدھیہ پردیش کی راجدھانی اور نوابوں کی نگری بھوپال میں پریس کونسل آف انڈیا (پی سی آئی) کے چیئرمین اور سابق جسٹس (ریٹائرڈ) مارکنڈے کاٹجو کی قیادت میں آنے والے 'اردو وراثت کارواں' کا استقبال کرتے ہوئے اہم شخصیتوں نے کیا۔ انھوں نے اس بات کا برملا اظہار بھی کیا کہ اس پرآشوب دور میں جب بعض طاقتیں ہندستان کے سماجی تانے بانے کو بکھیرنے کی سازشوں میں مصروف ہیں، اردو کا فروغ لازمی ہے کیوں کہ 'ہندستانیت' کے نظریے کی مکمل ترجمانی اگر کوئی ایک زبان کر سکتی ہے تو وہ اردو ہے۔ ریاست کے گورنر جناب رام نریش یادو نے 'اردو وراثت کارواں' کی آمد پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو اس ملک کی ایک عظیم زبان ہے جو یہیں پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ آزادی کی لڑائی میں اس زبان کی قربانیوں کو ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ہندستان کی دو بڑی قوموں ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کرنے کی سازش کے تحت اس وقت ملک پر قابض انگریزوں نے لسانی بنیادوں پر جھگڑے کرائے۔ پیپلز یونیورسٹی کے ہال میں کارواں کے اراکین، یونیورسٹی کے طلبہ، معززین شہر اور دیگر سامعین سے خطاب کرتے ہوئے گورنر موصوف نے مزید کہا کہ دلوں کو جوڑنے والی شیریں زبان اردو سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے کا جو بیڑا جسٹس کاٹجو اور ان کے ساتھیوں نے اٹھایا ہے وہ قابل تعریف ہے اور ملک کی وحدت و قومی یکجہتی کی خاطر اس تحریک میں ہر محب وطن ہندستانی کو شامل ہونا چاہیے۔

(انقلاب۔ دہلی)

اردو میڈیم ہائی اسکول شمس آباد کو علاحدہ کرنے کے لیے ضلع کلکٹر کو یادداشت

حیدرآباد (۱۵ دسمبر)۔ محمد مشتاق محی الدین (صدر مسلم ویلفیئر ایسوسی ایشن شمس آباد منڈل، رنگاریڈی) نے جناب محمد فصیح الدین (جنرل سکریٹری) کے ہمراہ ایک یادداشت ضلع کلکٹر رنگاریڈی کو شمس آباد اسکول اردو میڈیم کو علاحدہ کرنے کے لیے دی اور مطالبہ کیا کہ اردو میڈیم ہائی اسکول شمس آباد جو کہ تلگو میڈیم کے زیر نگرانی چل رہا ہے کو ایک الگ ہیڈ ماسٹر فراہم کرتے ہوئے علاحدہ کریں تاکہ اردو میڈیم اسکول میں بھی تعلیم کا نظام منظم اور بہتر ہو سکے۔ شمس آباد ہائی اسکول اردو میڈیم سیکشن کے طلبہ و طالبات کے والدین اور سرپرستوں نے ایک درخواست چند ماہ قبل دی تھی کہ طلبہ و طالبات (ایم پی) کی تعلیم اور ان کے روشن مستقبل کے لیے ضروری کارروائی کریں۔ اس وقت فوری کارروائی کرتے ہوئے صدر ایسوسی ایشن نے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے مختلف عہدیداروں بشمول ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر رنگاریڈی سے تحریری نمائندگی کی تھی لیکن ابھی تک کوئی کارآمد نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس لیے مشتاق محی الدین نے تحریری یادداشت ضلع کلکٹر رنگاریڈی کو پیش کی اور واضح کیا کہ علاحدگی میں دیری کی وجہ سے اردو میڈیم کے طلبہ و طالبات کو صحیح تعلیم نہیں مل رہی ہے اور تعداد میں بھی کمی ہو رہی ہے اور مطالبہ کیا کہ حکومت جلد سے جلد اردو میڈیم ہائی اسکول شمس آباد کو علاحدہ کرے۔ ضلع کلکٹر کو اس بات سے بھی واقف کروایا گیا کہ تمام بنیادی سہولیات مثلاً علاحدہ عمارت، باؤنڈری وال، بنچیں، مکمل فرنیچر اور اساتذہ وغیرہ اردو میڈیم ہائی اسکول کو علاحدہ کرنے کے لیے موجود ہیں۔ صرف ایک ہیڈ ماسٹر کی ضرورت ہے۔

(منصف۔ حیدرآباد)

اک دیا اور بجھا

پروفیسر حنیف نقوی

اردو کے مشہور محقق، نقاد اور غالب شناس پروفیسر حنیف احمد نقوی کا ۲۲ دسمبر ۲۰۱۲ء کی شام کو ان کے وطن سہسوان ضلع بدایوں میں 76 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ مرحوم کے پس ماندگان میں اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا اور پانچ بیٹیاں ہیں۔ پروفیسر حنیف نقوی نے ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں ہی حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں وکرم یونیورسٹی اجین سے بی اے میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن اور ایم اے اردو ۱۹۶۱ء میں وہیں سے فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے کامیابی حاصل کی۔ ایم اے (فارسی) بنارس ہندو یونیورسٹی میں ملازمت کے بعد ۱۹۷۳ء میں فرسٹ ڈویژن اور فرسٹ پوزیشن سے پاس کیا تھا۔ پروفیسر حنیف نقوی نے پروفیسر ابو محمد سحر کی زیر نگرانی 'اردو شعرا کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر معرکۃ الآرا تحقیقی مقالہ لکھ کر اردو میں وکرم یونیورسٹی سے ۱۹۶۸ء میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ انھوں نے اپنی تدریسی زندگی کا باقاعدہ آغاز نومبر ۱۹۶۱ء میں سیفیہ انٹر کالج بھوپال میں اسسٹنٹ ٹیچر سے کیا، اس کے بعد ایک سال تک حمیدیہ کالج بھوپال میں UGC جونیئر ریسرچ فیلو کی حیثیت سے کام کیا۔ یکم فروری ۱۹۶۸ء سے ۳۱ جولائی ۱۹۶۹ء تک شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں علی گڑھ تاریخ ادب اردو کے پروجیکٹ میں ریسرچ اسسٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ۶ فروری ۱۹۷۰ء سے ۲ فروری ۱۹۸۲ء تک بحیثیت لکچرر، ۳ فروری ۱۹۸۲ء سے ۲ فروری ۱۹۹۰ء تک ریڈر اور ۳ فروری ۱۹۹۰ء سے ۳۱ دسمبر ۲۰۰۰ء تک صدر شعبۂ اردو اور پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر بنارس کو ہی وطن ثانی بنالیا اور وہیں رہے۔ وفات سے دو تین ماہ قبل اپنے آبائی وطن سہسوان تشریف لے گئے تھے اور وہیں اپنے مالک حقیقی سے جاملے۔ پروفیسر حنیف نقوی کی 17 کتابیں اور سیکڑوں علمی و تحقیقی مضامین ہیں۔ انھیں میر اکیڈمی نے 'امتیاز میر' اور 'افتخار میر' جیسے ایوارڈز سے نوازا۔ غالب انسٹی ٹیوٹ نے غالب ایوارڈ اور اترپردیش اردو اکیڈمی نے مولانا ابوالکلام آزاد اور مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے کوثر چاند پوری ایوارڈ دے کر ان کی علمی و ادبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا۔

ادارہ 'ہماری زبان' مرحوم کے لیے مغفرت اور پس ماندگان کے لیے صبر جمیل کی دعا کرتا ہے۔ (ادارہ)

پروفیسر حنیف نقوی کی وفات پر اردو گھر میں تعزیتی نشست

نئی دہلی۔ اردو کے مشہور و ممتاز محقق اور نقاد پروفیسر حنیف نقوی کی وفات پر انجمن ترقی اردو (ہند) کے مرکزی دفتر اردو گھر میں ۲۴ دسمبر ۲۰۱۲ء کو پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کی صدارت میں ایک تعزیتی نشست منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر انجمن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی نے پروفیسر حنیف نقوی مرحوم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ان کے انتقال کو اردو تحقیق کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور کہا کہ حنیف نقوی صاحب نے مختلف علمی و ادبی موضوعات پر تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ انھوں نے 'اردو شعرا کے تذکروں کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ' کے موضوع پر معرکۃ الآرا تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ خدا انھیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عنایت کرے۔

ڈاکٹر اسلم پرویز نے خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ حافظ محمود شیرانی، قاضی عبدالودود اور امتیاز علی خاں عرشی جیسے اعلیٰ پائے کے محققین کے بعد اردو میں

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

نئی کتابیں

تبصرے کے لیے دو کتابوں کا آنا ضروری ہے

نام کتاب : اردو زبان سیکھنے کے لیے آسان اردو
مولف : محمد انورالدین
ضخامت : ۱۱۲ صفحات
قیمت : ۹۰ روپے
ملنے کا پتا : اردو بک ڈپو، گلشن حبیب، اردو ہال، حمایت نگر، حیدرآباد- 500029
تبصرہ نگار : تنظیم عالم قاسمی

کسی بھی زبان کا استعمال تذکیرو تانیث، واحد، تثنیہ، جمع، موصوف صفت، مبتدا خبر اور دوسرے اصول و قواعد کی پابندی کے ساتھ کیا جائے تو اس کے سننے میں بڑا لطف محسوس ہوتا ہے لیکن اگر اس کو مقررہ اصول سے آزاد ہو کر یوں ہی جیسا تیسا برتا جائے تو اس سے مفہوم تو ادا ہو سکتا ہے مگر زبان کی شیرینی اور لذت حاصل نہیں ہو سکتی۔ سننے والے کے دلوں میں وہ الفاظ کانٹے کی طرح چبھتے ہیں اور وہ تاثیر ختم ہو جاتی ہے جو سلیقے سے استعمال کیے گئے جملوں میں ہوتی ہے۔

اردو زبان کا بھی یہی حال ہے، بلاشبہ اردو شیریں اور حسین زبان ہے، اس پر بیک وقت عربی، فارسی اور ہندی کے اثرات کی وجہ سے اس میں جامعیت اور وسعت پائی جاتی ہے، اردو ادب کے مسلمہ اصولوں پر مبنی کلام موثر اور فرحت بخش ہوتا ہے، روح کو تازگی اور دلوں کو سرور ملنے کے ساتھ سامعین کے لیے وہ بار گراں نہیں ہوتا، کوئی تحریر خواہ کتنا ہی پُر مغز اور سواد سے بھرا ہوا ہو، املا کی غلطی، اصول کی عدم رعایت سے اس کا حسن ختم ہو جاتا ہے اور پھر سارا مواد مل کر بھی وہ اثر پیدا نہیں کرتا جو اصول و ادب کی روشنی میں تحریر کردہ مختصر تحریر سے حاصل ہوتا ہے، اس لیے اہل زبان نے اردو زبان کے لیے بھی اس کے اصول و آداب، تشکیل، املا سے متعلق قواعد، ایک حرفی اور دو حرفی کلمات کے مواقع استعمال وغیرہ تفصیل سے بیان کیے ہیں، اگر اردو ان اصولوں کی رعایت کے ساتھ سیکھی جائے تو پختہ ہونے کے بعد کوئی دشواری نہیں ہوتی اور اردو بولتے یا لکھتے ہوئے خود بخود لوگ زبان اور نوک قلم سے جملے قواعد کی ساخت میں ڈھلتے جاتے ہیں اور ابتدا میں اس طرح سیکھنا بعد کے مقابلے میں آسان ہے۔ اساتذہ شروع سے ہی حروف تہجی، ان کے اشکال، دو حرفی، سہ حرفی کے علاوہ جزم، تشدید، نون غنہ، تنوین، یائے معروف، یائے مجہول، واو معروف، واو مجہول وغیرہ کی صحیح شناخت کرا دیں تو کوئی وجہ نہیں کہ طلبہ کو اردو پر قدرت حاصل نہ ہو، لیکن افسوس ہے کہ آج کل اردو اصول و قواعد کے بغیر برائے نام ہی سکھائی جاتی ہے اور مخلصانہ محنت کے ساتھ مناسب و موزوں تدریسی طریقے اختیار نہیں کیے جاتے، اس لیے طلبہ کو دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی اور اخیر میں اسے چھوڑنے میں ہی وہ عافیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب کے مولف جناب محمد انورالدین مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنے تجربات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اساتذہ اگر مخلص ہوں تو اس زبان کا سیکھنا دشوار نہیں، ایک زبان سے ناواقف شخص کو کس طرح کیے بعد دیگرے تمرین دی جائے اور کس طرح رفتہ رفتہ زبان پر قدرت پیدا کرنے کی کوشش کی جائے، بہت اچھے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگر مدرسین اس کی رعایت کرتے ہوئے اسباق پڑھائیں تو زبان کا سیکھنا نہایت آسان ہوگا۔ یہ کتاب 73 اسباق پر مشتمل ہے، ہر سبق سے پہلے ہدایات دی گئی ہیں جن سے کسی پڑھانے والے کو رہنمائی حاصل ہوگی، مختلف اصول و قواعد کے مشق کے لیے جو تمرینات دی گئی ہیں ان سے مولف کی غیر معمولی محنت اور عرق ریزی کا پتا چلتا ہے۔ کتاب کے آخر میں جسم انسانی، انسانوں کی حالتیں، انسانوں کے مختلف روپ، رشتے ناطے، پیشوں کے نام، بیماریوں کے نام، موسموں کے نام، شمسی مہینوں کے نام، قمری مہینوں کے نام، پرندوں کے نام، پالتو جانوروں کے نام، جنگلی جانوروں کے نام، آبی جانوروں کے نام، کیڑے مکوڑے، پھل پھول وغیرہ اہم چیزوں کے نام دیے گئے ہیں جن سے تمرین کے ساتھ بچوں کی خارجی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

کتاب کے شروع میں کتاب کی خصوصیات اور اساتذہ کے لیے گزارشات کے عنوان سے 22 جامع نکات بیان کیے ہیں جو کتاب کی روح کی حیثیت رکھتے ہیں، بوقت تدریس اگر یہ ملحوظ رکھے جائیں تو اردو زبان کا تعلیمی و تدریسی سفر خوشگوار سے طے ہو سکتا ہے۔ پروفیسر فاطمہ بیگم پروین کے 'آسان اردو میری نظر میں' کے عنوان سے قابل قدر دیباچہ اور ڈاکٹر لئیق صلاح کے حوصلہ افزا تقریظ نے اس کتاب کے اندرون کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ عمدہ کاغذ، دیدہ زیب ٹائٹل اور خوب صورت کمپوزنگ کے ساتھ یہ کتاب منظر عام پر آئی ہے جو اردو زبان کے قدردانوں کے لیے قابل قدر تحفہ ہے۔

■◆■

نام کتاب : نقوش دوام
مرتب : محمد ساجد کھجناوری
ضخامت : ۲۴۴ صفحات
قیمت : ۲۰۰ روپے
ملنے کا پتا : دفتر اہتمام جامعہ اشرف العلوم رشیدی، گنگوہ، سہارنپور
تبصرہ نگار : عمران عظیم ایڈوکیٹ

زیر نظر کتاب 'نقوش دوام' صوری و معنوی اعتبار سے دلکش و دیدہ زیب ہے جو قاری شریف احمد صاحب کی حیات و خدمات کے اعتراف میں علمی و ادبی شخصیات کا خراج تحسین ہے۔ محمد ساجد کھجناوری قاسمی نے نہایت لگن اور سعادت مندی کے ساتھ اس کتاب کو مرتب کیا ہے، اس سلسلے میں محمد ساجد صاحب کے رفیق خاص مولانا عبدالواحد ندوی نے بھی ان کا حوصلہ بڑھایا ہے تاکہ کوئی گوشہ ادھورا اور تشنہ رہنے نہ پائے۔ مرتب موصوف نے اس کتاب کے ذریعے قاری شریف احمد کی زندگی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ باکمال، حوصلہ مند اور محنتی انسان تھے، اپنی کاوشوں اور عزم و عمل سے مدرسے کی تعمیر و تشکیل میں خون جگر صرف کر رہے تھے۔ 'نقوش دوام' کے مشمولات میں پہلا باب 'پیغامات مشاہیر'، دوسرا باب 'نوائے دل'، تیسرا باب 'سوانحی نقوش و تاثرات'، چوتھا باب 'اعتراف عظمت و کمال'، پانچواں باب 'منظومات'، چھٹا باب 'تعزیتی مراسلات' اور ساتواں باب 'متفرقات' شامل ہے۔ مذکورہ کتاب کے سبھی مشمولات میں قاری شریف احمد گنگوہی کی حیات آفریں خدمات اور کارناموں پر سیر حاصل تحریریں ہیں۔

مفتی خالد سیف اللہ نے اپنے والد ماجد کے چند اوصاف و کمالات کا تذکرہ نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کیا ہے جس سے مرحوم کا قرآن کریم کے ساتھ والہانہ عشق و تعلق، خدمت خلق، رشتے داروں اور احباب کے ساتھ ان کے حسن سلوک اور ان کی جود و سخاوت، ان کی ہمت و شجاعت و صبر و تحمل اور مدرسے کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات و مصائب کا بخوبی پتا چل جاتا ہے۔

مولانا عبدالواحد رشیدی ندوی کا مضمون 'علمائے حق کی ایک اور کڑی' پُر مغز اور معلوماتی ہے جو ہر اعتبار سے مرتب و جامع ہے۔ مولانا عبدالواحد رشیدی اپنے مضمون میں ایک بات بہت پتے کی کہہ جاتے ہیں، ملاحظہ کریں:

"نسبی اولاد کے ساتھ ساتھ اللہ پاک نے آپ کی روحانی اولاد کو اس قدر بڑھایا کہ آپ کا علمی، روحانی، گلی فیضان پورے عالم، برّاعظم افریقہ، یورپ، سعودیہ، امریکا اور دیگر ممالک میں پھیلا اور پھیل رہا ہے اور انشاء اللہ العزیز تاقیامت پھیلتا رہے گا"۔

حضرت والد گرامی اور خدمت خلق پر ان کے صاحبزادہ مولانا قاری عبدالرحمن قاسمی کا مضمون مختصر مگر جامع ہے جس میں مولانا شریف احمد مرحوم کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا ذکر کیا گیا ہے جس سے ان کی اُس خدمت خلق سے آگہی ہوتی ہے جو سب کے لیے چراغ راہ کی طرح ہے۔

'آسمان علم کا شاہین' حافظ نسیم انور ایوبی کا مضمون ہے جس میں گنگوہ کی تاریخی اور مولانا کی ادارے سے متعلق دلچسپی اور لگن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ ابتدائی یہ چند سطور ہی قاری شریف احمد کی شخصیت اور ان کی عملی زندگی کا پتا دیتی ہیں:

"بادی النظر میں یہ ایک نام صرف ایک عام نام ہے مگر افادیت کے اعتبار سے ایک یونیورسٹی، ایک انسائیکلوپیڈیا کا روشن عنوان ہے"۔

'مدت کہیں جا کر تو پھرتا ہے فلک برسوں' بزرگ شاعر و ادیب نیر قریشی گنگوہی کا مضمون حقائق پر مبنی ہے، جس میں انھوں نے معروضی انداز میں تجزیہ کیا ہے اور نہایت اعتماد، خلوص اور اپنائیت کے ساتھ نتیجہ برآمد کیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"حضرت قاری صاحب کے تعلق نے میں وہ خوش نصیب ضرور ہوں کہ مجھے ان کے قرب کا شرف بھی

نہیں تھا بلکہ وہ بھی شاعر، دانشور اور سیاسی ذوق رکھنے کے باوجود ہم مزاج و ہم خیال جان کر کبھی کبھار کچھ تعمیری منصوبوں پر تبادلۂ خیال بھی کر لیتے تھے، کچھ اہم اور مخصوص میٹنگوں میں بھی یاد کیا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ یاد ضرور کیا کرتے تھے۔ واقعی وہ انتہائی لائق، باصلاحیت اور جد وجہد میں یقین رکھنے والے 'ہمہ تن' بھی تھے اور منتظم بھی اور شہر کے ناخداؤں سے اُن کی کبھی نہیں بنی تھی'۔

اس کتاب کے تمام مشمولات مفید مطلب اور دل کو چھونے والے ہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'نقوشِ دوام' ایک ایسی قابلِ مطالعہ کتاب ہے جو اپنے قارئین کے اذہان پر ایک اچھا تاثر مرتب کرتی ہے۔

■◇■◇■◇■

بقیہ: 'بابر کی اولاد' ایک تجزیاتی مطالعہ

صفحہ ۸ سے آگے

'بابر کی اولاد' ترجمہ کیا ہے جو یقیناً موضوع سے مطابقت اور فسطائی ہندو سیاست پر ان کی گہری نظر کا غماز ہی نہیں نہایت فصیح بھی ہے جو اردو زبان پر اطہر فاروقی کی غیر معمولی قدرت کا ایک اور ثبوت ہے۔

سلمان خورشید کا یہ پلے اس مرکزی سوال، وہ کیا عناصر ہیں جو ہندوستانی شناخت کی تشکیل کرتے ہیں، کی مختلف تعبیروں کو تجزیہ و تحلیل کے عمل سے گزار کر ایک ایسے تخلیقی تجربے کے طور پر پیش کرتا ہے جس کی اپیل ہمہ حسی (Multi Sensory) ہے۔ یہاں صرف سیاسی محرکات، نفسی کوائف، اقتدار کی مصلحتوں اور مجبوریوں، طاقت کے کھیل کے مکروہ مناظر، تاریخی حقائق اور معاشرتی رسوم کو فنی چابک دستی ہی کے ساتھ پیش نہیں کیا گیا ہے بلکہ معاصر معاشرتی صورت حال پر انتہائی بلیغ تبصرے بھی کیے گئے ہیں۔ مصنف نے بہادر شاہ ظفر کے حوالے سے عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ کے بعض بہت اہم اور تشنۂ تعبیر سوالوں کو مرکزِ نگاہ بنایا ہے اور عہدِ حاضر کے سب سے اہم مسئلے، ہندو مسلم تنازعے کے تاریخی تناظر اور قومیت کی بحث کے لیے امکانات کو بھی ہویدا کیا ہے۔ مصنف عہدِ وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، قومیت کے تصور کے فروغ کے مختلف ادوار اور تقسیم کے بعد کی ہندوستانی سیاست کے بدلتے ہوئے مزاج سے کماحقہ واقف ہیں لہٰذا انھوں نے تاریخ کے طلبہ روز، انشو، مترا، پربھات شرما، آفتاب ملک، سادھو، جوتس اور ڈاکٹر داس کے علاوہ مغل بادشاہوں، شہزادوں، بیگمات اور متعدد درباریوں اور سپہ سالاروں مثلاً بابر، گل بدن، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، نور جہاں، شاہ جہاں، جہاں آرا، اورنگ زیب، بہادر شاہ ظفر، شاہ عالم، راجا مان سنگھ، ابوالفضل، مہابت خاں اور رخیہ بیچ سنگھ وغیرہ کو بطور کردار یا ان کے مکالموں کے حوالے سے بعض تاریخی غلط فہمیوں کا بھی پردہ چاک کیا ہے اور بعض حقائق کی نئی توجیہ بھی کی گئی ہے۔

اسلامی حکومت میں غیر مسلموں پر جزیہ کا نفاذ ایک متنازعہ فیہ امر ہے۔ اکبر نے اس پر پابندی لگا دی تھی اور اس بنا پر علما اور قدامت پرستوں نے اس کی پرزور مخالفت بھی کی تھی۔ دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چوں کہ غیر مسلم حضرات پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے لہٰذا انھیں جزیہ دینا پڑتا ہے۔ مصنف نے اکبر کی زبانی اس دلیل کا قرار واقعی ابطال کیا ہے۔ ''زکوٰۃ خدا کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کی گئی ہے اور ہم خدا نہیں ہیں کہ ہندوؤں پر اس قسم کا دوسرا ٹیکس اس لیے عائد کر دیں کیوں کہ غریبوں کی مدد کی غرض سے خدا نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کیا ہے، اس لیے جزیے کی وصولی کا کوئی جواز نہیں ہے۔ ہمیں اپنی ہندو رعایا کی حتی المقدور حفاظت کرنی چاہیے کیوں کہ وہ اسی طرح ہماری ذمے داری میں ہیں جس طرح ہمارے مسلم بھائی ہیں''۔

مصنف نے اس سوال کو بھی مرکزِ توجہ بنایا ہے کہ آخر کبھی کسی مغل شہزادی کی شادی کسی راجپوت سے کیوں نہیں کی گئی۔ مصنف کے مطابق اکثر تو مغل شہزادیاں غیر شادی شدہ ہی رہیں۔ اس سلسلے میں مزید وضاحت بہادر شاہ ظفر کے درج ذیل مکالمے سے ہوتی ہے:

''مغل شہزادیوں کے راجپوتوں سے بیاہے نہ جانے کا سبب مذہب یقیناً نہیں تھا۔ شہنشاہ اکبر مذہب کے فرسودہ تصور میں یقین نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے راجپوت رانیوں سے شادی اس لیے کی اور راجپوتوں کو اعلا عہدوں پر اس لیے متمکن کیا تاکہ اقتدار میں توازن قائم رہے لیکن اگر مغل شہزادیوں کی شادی راجپوت گھرانوں میں ہوتیں تو طاقت کا وہ توازن ختم ہو جاتا۔ رعایا چاہے مقتدر ہی کیوں نہ ہو اس کے اور حکمراں کے درمیان حدِ فاصل ختم نہیں ہونی چاہیے''۔

سلمان خورشید نے تاریخ کے طالب علم مترا کی بہادر شاہ ظفر سے تمثالی ملاقات پر حقیقت کا التباس (hellucination) پیدا کرنے کی غرض سے اسے ایک نفسی تجربے کے طور پر پیش کیا ہے اور پھر مغل سلطنت کے مختلف فرماں رواؤں کے درباروں میں مترا کو موجود دکھایا ہے اور تاریخی حقائق کے اصلی تناظر کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ سلمان خورشید کا یہ پہلا پلے ہے مگر انھوں نے اپنے اس اولین پلے میں نہ صرف اپنی گہری علمی لیاقت اور تاریخی بصیرت کا وافر ثبوت پیش کیا ہے بلکہ اپنی فنی مہارت کے بھی انمٹ نقوش مرتسم کیے ہیں۔

پلے کی مرکزی تھیم اور ٹریٹمنٹ کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر یہ بھی ضروری ہے کہ مترجم کے کمالِ ہنر پر بھی گفتگو کی جائے۔ اطہر فاروقی نے پلے کے ترجمے پر اتنی محنت کی ہے کہ اردو میں پلے پر ترجمے کا شائبہ تک نہیں گزرتا۔ اس لیے 'بابر کی اولاد' پر ترجمے کے چار اصولوں کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اطہر فاروقی نے ترجمے میں دونوں زبانوں پر اپنی قابلِ لحاظ مہارت کا ثبوت دیا ہے اور محض یہ کہہ دینا کہ ترجمہ بہت رواں دواں اور سلیس ہے، مترجم کے ساتھ بے انصافی کرنے کے مترادف ہے۔ اطہر فاروقی نے ترجمے میں بڑی دقتِ نظر کا ثبوت دیا ہے اور عبارت کو ہر حال میں Readable بنائے رکھنے کی قابلِ قدر سعی کی ہے۔ انھوں نے ترجمے کے بنیادی اصول یعنی ترسیل کو اپنا اولین ہدف بنایا ہے اور انگریزی، ہندی، عربی و فارسی کے وہ تمام الفاظ جن سے مفہوم کی بہتر ادائیگی ہو سکتی تھی، کے استعمال میں کوئی تکلف نہیں کیا ہے۔ ترجمے میں بعض عام فہم انگریزی الفاظ کے ساتھ اردو داں حلقوں کے لیے کسی حد تک نامانوس الفاظ تو استعمال کیے ہیں مگر ان کے محل استعمال میں جس زبان دانی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس سے کہیں بھی عبارت مبہم نہیں ہوتی ہے۔ اطہر فاروقی نے اگر ایک طرف انگریزی الفاظ مثلاً پلے، ڈرافٹ، پرفورمینس، فورسیٹ، سنٹرل تھیم، ریڈیگ سیشن، ٹریٹمنٹ، بورنگ، ٹیکس، پیٹرو، پولیٹکل، کرکٹ، وژن وغیرہ استعمال کیے ہیں تو دوسری طرف بعض مفرس تراکیب 'گوشۂ عزلت'، 'دورِ اسیری'، 'تحتِ التفات' کے علاوہ بعض الفاظ کے جوڑوں مثلاً سرخرو اختتام، غیر مجاز خاتون، پرفریب تشریح وغیرہ کا تخلیقی استعمال بھی کیا ہے۔ بہادر شاہ ظفر کی زبان اس عہد کی زبان سے بڑی حد تک مطابقت رکھتی ہے۔ مترا کے مکالمے دیکھیے جن میں ترجمے کی زبان اور تاریخ نویسی کے عمل پر اطہر فاروقی کی گہری نظر نے کیسا جادو جگایا ہے:

''یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ عظیم تاریخ واقعات سے مرتب ہوتی ہے۔ تاریخ نویسی کے موجودہ معیاروں پر ابوالفضل کی حیثیت بس ایک وقائع نگار کی ہے۔ انھوں نے واقعات کی کھتونی مرتب کر دی ہے، ان کا تجزیہ نہیں کیا ہے اور دربار سے وابستہ ہونے کے سبب وہ یہ کام کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ایک جدید مورخ کی حیثیت سے میرا کام یہ ہے کہ ماضی کے واقعات کو صحیح تناظر میں مرتب کروں اور ان کے اسباب و اثرات پر بھی غور کروں تاکہ مستقبل سے روبرو ہونے کی تیاری کی جاسکے''۔

مترجم نے محض لفظی یا لغوی ترجمے تک خود کو محدود نہیں رکھا ہے، اس وجہ سے کے حق میں وافر شہادتیں ترجمے کے متن میں موجود ہیں اور ناسپاسی ہوگی اگر مترجم کی محنتِ شاقہ کی داد نہ دی جائے جو پلے کی کامیابی کا اصل سبب ہے۔

■◇■

پروفیسر حنیف نقوی کی وفات پر اردو گھر میں تعزیتی جلسہ

(بقیہ صفحہ ۵ سے آگے)

نے محققین کی جو نسل ابھر کر آئی ان میں ایک نمایاں نام حنیف نقوی صاحب کا بھی ہے۔ زمانۂ حال میں اردو میں جو گنے چنے نام نقاد رہ گئے تھے، ان میں رشید حسن خاں کے بعد حنیف نقوی کا بھی نام لیا جاسکتا ہے اور اب رشید حسن خاں کے بعد حنیف نقوی صاحب بھی اردو کی بساطِ تحقیق سے معدوم ہو گئے، ان کے لیے مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔

جناب سید شریف الحسن نقوی نے کہا کہ پروفیسر حنیف نقوی کی وفات سے اردو ادب ایک غیر معمولی ذہین محقق اور نقاد سے محروم ہو گیا۔ انھوں نے کئی ایسے گراں قدر تحقیقی و تنقیدی کارنامے انجام دیے جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاکٹر خلیق انجم جو بوجوہ اس تعزیتی نشست میں شامل ہونے سے قاصر تھے، اس لیے انھوں نے مجھ بذریعہ فون پروفیسر حنیف نقوی کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ادبی اعتبار سے حنیف نقوی صاحب کی موت کا غم میرے لیے سگے بھائی کی سی موت کا غم ہے، اس لیے کہ یوں تو میں نے مختلف اصنافِ نثر میں بُرا بھلا بہت کچھ لکھا ہے لیکن تحقیق میری دلچسپی کا خصوصی موضوع رہی اور خدا کا شکر ہے کہ اردو کی تحقیقی روایت میں ہمارے اُن محققین کے بعد جو ہم سے جدا ہو چکے ہیں، جن لوگوں نے اردو تحقیق کی آبرو کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ان میں حنیف نقوی کا نام بجا طور پر لیا جاسکتا ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اب اردو میں اعلا پائے کی تحقیق کے امکانات کے بارے میں ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ میں ان الفاظ کے ساتھ حنیف نقوی صاحب کے لیے مغفرت کی دعا کرتا ہوں اور یہ بھی کہ خدا ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

تعزیتی نشست کے صدر پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ حنیف نقوی صاحب عہدِ حاضر کے اردو محققین میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ اردو تحقیق جس تیزی کے ساتھ ایسے محققین سے محروم ہوتی جارہی ہے اتنی رفتار کے ساتھ اس پائے کے نمایاں محققین پیدا ہوتے نظر نہیں آرہے ہیں، اس لیے اردو کی تحقیقی روایت کے تناظر میں حنیف نقوی جیسے معتبر محقق کی موت اور تحقیق کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔

☆☆☆

'بابر کی اولاد': ایک تجزیاتی مطالعہ

پروفیسر شافع قدوائی (شعبۂ ترسیلِ عامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ)

تاریخی واقعات یا کرداروں کے اعمال و افعال کو مرکز توجہ بنا کر معاصر صورت حال کا فنی رویہ خلق کرنا فن کار کی تخلیقی انفرادیت کا ناقابل تردید ثبوت ہوتا ہے۔ تاریخ پر ظاہرا واقعات کے قرار واقعی اور معروضی بیان نیز غلط تعبیروں، تضادات اور غلط فہمیوں کے لاختتام سلسلے اور اس کے استرداد کا نام ہے تاہم اسی موضوع کا فنی اظہار، خواہ وہ ناول کی شکل میں ہو یا ڈرامے کی صورت میں، تاریخ کو وسیع تر انسانی سروکاروں، معاشرتی حقائق اور ثقافتی اقدار کے تعلق سے ایک ماورائی جہت عطا کرتا ہے۔ شخصی سطح پر اپنے تشخص پر اصرار اور اپنے وجودی سروکاروں کا اثبات ادب کا مقبول ترین موضوع ہے۔ تاہم ایک بیحد اجتماعی تجربے کو تاریخی حقائق، نسلی آویزش، عقائد کی کشمکش اور اقتدار کی کشاکش کے تناظر میں ایک انفرادی حسی تجربہ بنا دینا ایک دشوار گزار مرحلہ ہے اور ان مسائل کا اظہار تبھی معروضی شکل کم ہی اختیار کر پاتا ہے۔ ان موضوعات کو محیط بیان کا نیم تخلیقی اظہار اکثر ایک خیال انگیز Narrative بن جاتا ہے۔ پنڈت نہرو کی کتاب 'ہندستان کی تلاش' (Discovery of India) اسی ذیل میں آتی ہے جس کے مشمولات کا اجمالی اور منتشر اظہار واقعات کی تفصیل سے روگردانی نہیں کرتا۔ ہندستان کی تلاش کا کینوس بیحد وسیع ہے اور موضوعات کی پیش کش بھی بہت تخلیقی ہے تاہم یہاں کسی ایک مخصوص عہد یا مروج نظام حکومت یا بعض مرکزی کرداروں کے حوالے سے تشخص کے امتیازات کو بنیادی موضوع کے طور پر نہیں برتا گیا ہے۔

ہندستان کا مزاج بنیادی طور پر تکثیری ہے اور اس کی شناخت متضاد اور مختلف حوالوں سے مرتب اور متشکل ہوتی ہے۔ تاہم ہر تضاد رواداری کے بیحد تصور سے آمیز ہو کر کثرت میں وحدت کا قابل رشک نمونہ پیش کرتا ہے۔ اس سیاق و سباق میں بعض ایسے سوالات سے ہمارے مفکرین اور معروف سیاسی رہنما، ماہرین قانون اور سرکردہ دانشور عرصۂ دراز سے نبرد آزما رہے ہیں مثلاً ہندستانیت کے تشکیلی عناصر کیا ہیں؛ مذہب، زبان اور نسل کے اختلافات کے باوجود کس طرح یہ تصور ایک اجتماعی تجربہ بن جاتا ہے اور اس کے اس مخصوص کردار کو مسخ کرنے کی تشدد آمیز کوششیں صرف لمحاتی کامیابی ہی حاصل کر پاتی ہیں؛ ہندستان کی تاریخ کے بعض ادوار کو مطعون کرنے اور پھر اسی حوالے سے اس عہد کے مخصوص باشندوں کو مورد الزام ٹھہرانے کی کوششیں کیوں کر ہمارے اجتماعی تجربے کا مرکزی حصہ نہیں بن سکتیں۔ اس فہرست میں ایک نام سلمان خورشید کا ہے جو عرصے سے اس نوعیت کے سوالات سے نبرد آزما رہے ہیں۔ ان کی سوچ کا اظہار تخلیقی صورت میں Sons of Babur نام کے پلے کی شکل میں تخلیق ہوا۔ دراصل یہ پلے انھوں نے انگریزی میں لکھا اور اس کا اردو ترجمہ اطہر فاروقی نے اردو اور دیوناگری دونوں رسم خط میں روپا اینڈ کمپنی، نئی دہلی سے 2008 میں شائع کرایا۔ اطہر فاروقی کا یہ بے مثال اردو ترجمہ نہ صرف ان کی ترجمے کی غیر معمولی صلاحیت کا عکاس ہے بلکہ سہولت اظہار اور ڈرامے کی صنف اور اسے اسٹیج پر پرفارم کرنے کی تکنیک سے اطہر فاروقی کی واقفیت کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔ یہ بات اس لیے قابل ذکر ہے کہ ڈرامے یا اردو ڈرامے سے اطہر فاروقی کی دل چسپی سے اردو دنیا واقف نہیں جب کہ وہ اردو کی علمی دنیا میں احترام سے لیا جانے والا نام ہے۔ دوسری دل چسپ بات یہ ہے کہ اردو میں ڈرامے تو بہت لکھے گئے مگر ایسے ڈرامے بہت کم ہیں جنھیں اسٹیج کیا جا سکے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ڈرامہ ایک Performing Art ہے جو لکھا اس لیے جاتا ہے کہ اسے پرفارم کیا جائے۔ بغیر پرفارمنس کے کسی ڈرامے کے متن کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ پرفارمنس کے بعد اکثر یہ متن شائع ہو جاتا ہے۔ اس شائع شدہ متن اور پرفارمنس میں ایک آدھ لفظ ہی کا فرق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس اردو میں بہ وجوہ ڈرامے لکھے تو بہت گئے اور ان کی ادبی حیثیت پر تنقیدی بحثیں بھی ہوئیں مگر ان کی اکثریت اس لیے پرفارم نہ ہو سکی کہ ڈرامہ لکھنے والے کو اسٹیج کی ضرورتوں کا اکثر صورتوں میں اندازہ ہی نہیں تھا، اور تو اور مشہور زمانہ ڈرامہ انارکلی بھی جس شکل میں پرفارم ہوا وہ اس کی تحریری شکل سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے اس ذیل میں آتے ہیں جو پہلے پرفارم ہوئے اور پھر زیور طباعت سے آراستہ کیے گئے۔

سنس آف بابر کا اردو اور دیوناگری میں ترجمہ اردو متن میں شائع شدہ، پہلا ایسا ڈرامہ ہے جس کی اسٹیج پرفارمنس کا سلسلہ بعد میں شروع ہوا جب کہ یہ طبع پہلے ہو گیا۔ اب تک اس کے متعدد شو انگریزی اور اردو دونوں ہی زبانوں میں ملک کے مختلف شہروں کے اُن ایوانوں میں منعقد ہو چکے ہیں جو تھیٹر خصوصاً انگریزی تھیٹر کے شائقین کا مرکز ہیں، اس طرح، اطہر فاروقی نے پہلی بار اردو کے ایک پلے کو انگریزی والے Theatre buffs میں استناد دے دیا۔ پلے کا ایک انتہائی کامیاب شو ۱۰ اکتوبر ۲۰۱۲ کو بھارتیہ ودیا بھون لندن میں ہوا۔ اتنے بڑے بجٹ اور اتنی طویل طویل کاسٹ کا یہ پہلا اردو پلے تھا جو انگلینڈ میں پرفارم ہوا۔ بہادر شاہ ظفر کا مرکزی کردار مشہور اداکار ٹام آلٹر نے ادا کیا ہے۔ اس سے بھی زیادہ دل چسپ بات یہ ہے کہ انگریزی میں جو متن پرفارمنس کے لیے تیار کیا گیا وہ بھی اطہر فاروقی ہی کا تلخیص کردہ ہے۔

یہاں میں ایک اور نئی بحث سے گریز کرتے ہوئے صرف اس کی طرف اشارہ کر کے آگے بڑھ جاؤں گا۔ دراصل ڈرامے کا رسم خط سے کچھ لینا دینا نہیں اور اردو اور ہندی دونوں ہی زبانوں کی شناخت ان کے رسم خط سے ہوتی ہے بلکہ اس بات کو یوں کہیں تو زیادہ مناسب ہوگا کہ اردو اور ہندی کے سیاق و سباق میں بغیر رسم خط کے کسی زبان کا کوئی وجود نہیں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈرامے کا متن پرفارمنس کے لیے لکھا یا یوں کہیں کہ تیار کیا جاتا ہے جو ہندستان کی حد تک عام طور پر دیوناگری یا رومن میں ہوتا ہے۔ کسی ڈرامے کو اردو یا ہندی ڈرامہ کہنا بحث طلب اس لیے ہے کہ یہ اس صنف کی بنیاد Spoken word ہے۔ دوسرے امور سے قطع نظر کی یہ بات دل چسپ ہے کہ بابر کی اولاد کی کاسٹ میں شامل اسّی فی صد اداکاروں کو اردو رسم خط نہیں آتا اس لیے اس کا اسٹیج اسکرپٹ بھی رومن میں تیار کیا گیا۔ اطہر فاروقی اردو کی معاصر سیاسی و سماجی صورت حال کے واحد اور مستند اسکالر ہیں اس لیے انھوں نے انگریزی متن کا ترجمہ شائع تو اردو اور ہندی دونوں ہی رسم خط میں کرایا مگر پرفارمنس کی زبان کو اردو رکھا۔

اردو میں شاعری کی استثنائی مثال سے قطع نظر دیگر ادبی اصناف سے متعلق کتابیں کم شائع ہوتی ہیں اور ڈرامے تو شاذ ہی شائع ہوئے ہیں۔ ڈرامہ لکھنے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا اسے اسٹیج کرنے کی روایت اردو میں بہت کم برگ و بار لا سکی ہے لہٰذا اس صورت میں 'بابر کی اولاد' کا اردو ترجمہ زبان کو ثروت مند بنانے کا معنی خیز استعارہ بن جاتا ہے۔ ڈرامے کا عنوان موضوع کی Foreshadowing کرتا ہے کہ یہ فقرہ ملک کی فسطائی قوتیں مسلمانوں کے لیے انتہائی حقارت کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔ اطہر فاروقی نے آل کے مقابلے میں لفظ "اولاد" میں مضمر تحقیر کے عنصر کو پیش نظر رکھا اور طنزیہ اظہار کی سفاکی کو قائم رکھنے کے لیے آل بابر کے بجائے

(بقیہ صفحہ ۷ پر)

اڈیٹر: اطہر فاروقی
شریک مدیر: محمد عارف خاں
پرنٹر پبلشر: شاہد خاں   مطبوعہ ثمر آفسیٹ پرنٹنگ پریس، دہلی
مالک: انجمن ترقی اردو (ہند)، اردو گھر، ۲۱۲- راؤز ایونیو، نئی دہلی- ۱۱۰۰۰۲
قیمت (فی شمارہ): دو روپے، سالانہ: ۸۵ روپے (بیرونی ممالک: آٹھ امریکن ڈالر)
Phones: 23237210, 23236299, Fax: 011-23236299
E-mail: hamarizaban@anjumantaraqqiurduhind.org
http://www.anjumantaraqqiurduhind.org